جہان ذوقی

ایک گفتگو مشرف عالم ذوقی سے

ڈاکٹر شافعہ

دوآبگاہ، بارہمولا، کشمیر

Mob No: 7780801336

شافعہ: ذوقی صاحب آپ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیں؟

ذوقی: میرا گھرانہ سیدیوں کا گھرانہ ہے، ہم چودھری کہلاتے ہیں۔ چودھری کا خطاب انگریزوں کی طرف سے ملا تھا۔ میرے وطن آرہ میں بھی ایک محلے کا نام چودھرانہ ہے۔ اس محلے میں زیادہ تعداد چودھریوں کی ہیں۔ میرا تعلق چشتیہ اور قادریہ سلسلے سے بھی رہا ہے۔ ابا حضور تین بھائی تھے۔ میرے والد کا نام مشکور عالم بصیری تھا، بصیریؔ تخلص تھا۔ آنکھیں کھولنے کے بعد خاندانی پس منظر کے بارے میں یہ بھی سننے میں آیا کہ ہمارے آباواجداد باہر سے آئے تھے۔ وہ بہار میں کب آئے، کیسے آئے اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہے۔ میرے دادا حضور کا نام محفوظ عالم تھا وہ ایک مشہور وکیل تھے۔ سیاست سے بھی اُن کا گہرا تعلق تھا۔ میرا گھر کوٹھی کہلاتا تھا اور میرے گھر میں مہاتما گاندھی سے لے کر محمد علی جوہر اور ان کی اماں جان بھی آچکی تھیں۔ میرا گھرانہ مجموعی طور پر ایک ادبی گھرانہ ہے۔ ابا حضور مشکور عالم نہ صرف شاعری کرتے تھے بلکہ خاموشی سے ادبی مضامین وغیرہ بھی لکھا کرتے تھے۔ اُن کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ میں یہ بات کئی بار کہہ چکا ہوں کہ جب میں نے آنکھیں کھولیں میری ادبی تربیت گھریلو ماحول میں ہوئی۔ ابا حضور کہانیاں سُنایا کرتے تھے۔

گرمی کا موسم ہوتا تو چھت پر پلنگ بچھ جاتی۔ ہم بھائی بہن ابا کو گھیر کر بیٹھ جاتے اور اس وقت ابا حضور دنیا بھر کی داستانیں سُنایا کرتے تھے۔ ان داستانوں کو سنتے ہوئے میں بچپن سے ہی ادب کی دنیا میں آ گیا۔ کم عمری میں ہی لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ میرے بڑے ابی کا نام محبوب عالم تھا۔ وہ بھی بنیادی طور پر شاعر تھے۔ کتابیں پڑھنے، مطالعہ کرنے، شاعری کرنے کے علاوہ اُن کا ایک محبوب شوق تھا کبوتروں کو اُڑانے کا۔ وہ بہت نفیس انسان تھے۔ باضابطہ ہر مہینے اُن کے گھر میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ میں مشاعرے میں پابندی سے شریک ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے بلکہ میری تحریروں کو شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ والد محترم اور بڑے ابی کے درمیان ایک فرق تھا۔ ابا حضور کبھی میرے منھ پہ میری تعریف نہیں کرتے تھے۔ میں اکثر امی جان سے سُنا کرتا تھا کہ ابا حضور کہا کرتے تھے کہ مشرف ایک دن بہت بڑا ادیب بنے گا۔ لیکن چچا جان نہ صرف میری تحریروں کو پڑھتے تھے بلکہ مجھ سے گھنٹوں ادبی موضوعات پر گفتگو بھی کرتے تھے۔ اس لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری ادبی تربیت میں ایک خاموش ہاتھ بڑے ابا مرحوم کا بھی رہا ہے۔ میرے چھوٹے ابی کا نام چودھری مشتاق عالم تھا۔ وہ پولیس محکمے میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق اُن کو بھی تھا۔ انگریزی کتابوں کے علاوہ وہ ابنِ صفی اور اکرم اعلی آبادی کے فین تھے۔ میری بہنوں میں بھی ادب کا شوق اسی ماحول نے پیدا کیا۔ میرے بڑے بھائی کا نام مسرور آوری ہے۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا اُس سے قبل بھیا یعنی مسرور آوری انشائیہ نگاری کے میدان میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب اُن کے انشائیے ہندو پاک کے تمام بڑے ادبی رسائل میں شائع ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے ''شرفو کا ہوٹل'' کے نام سے ایک انشائیہ نما ناول بھی تخلیق کیا تھا۔ ان کے انشائیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کا نام منور عالم ہے تخلص شوقؔی۔ منور عالم شوقؔی کو مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ منور مجھ سے چار برس چھوٹے ہیں۔ مطالعہ کا اتنا شوق ہے کہ انہوں نے شادی بھی نہیں کی، پوری زندگی کتابوں کے درمیان بسر کی۔ ادب کے علاوہ سائنس، جغرافیہ، فلسفہ، نفسیات اور دیگر

علوم پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ وہ ابھی بھی زیادہ تر غیر ممالک سے نکلنے والے رسائل میں مضامین لکھا کرتے ہیں۔ میری بڑی بہن کا نام مسرت جہاں ہے۔ انہوں نے حالؔی کی شخصیت پر اردو میں پی۔ ایچ ڈی کی ہے۔ حالؔی پر ان کی ایک کتاب بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔ ان دنوں وہ اپنے بچوں کے ساتھ آسٹریلیا میں رہتی ہے۔ عصمت جہاں میری منجھلی بہن کا نام ہے۔ میری چھوٹی بہن کا نام زینت جہاں ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق میرے پورے خاندان کو ہے۔ میری بہنیں گھریلو مزاج کی ہیں، یہ اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ خوش ہیں۔ میرا گھرانہ ایک مذہبی گھرانہ رہا ہے۔ لیکن مذہب کو کبھی ہمارے اوپر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

شافعہ: آپ نے جب آنکھیں کھولیں تو گھریلو حالات کیسے تھے؟

ذوقی: میں اپنے خاندان کے بارے میں کیا کہوں، ایک میڈل کلاس خاندان جیسے اُس زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ ایسا ہی میڈل اپر کلاس خاندان میرا بھی تھا۔ آنکھیں کھولیں تو جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس جاگیردارانہ نظام کے تذکرے میرے اکثر ناولوں میں آئے ہیں۔ ان دنوں جب میں نے اپنا ایک ناول لکھا تھا 'نیلام گھر' اس میں بھی اس جاگیردارانہ نظام کے ختم ہونے کی تفصیلات درج تھیں۔ کوٹھی کے در و دیوار خستہ ہو چکے تھے۔ شروعات میں سارا خاندان ایک ساتھ ہی رہتا تھا پھر آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے بعد یہ مکان بھی تین حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ لیکن مجھے آج بھی وہ زمانہ یاد آتا ہے جب ہم سب ایک ساتھ مل کر رہتے تھے، ایک ساتھ ایک دوسرے کے دکھ درد کا حصّہ بن جاتے تھے۔ ہمارے گھر میں ایک بڑا سا آنگن تھا جس میں ہم نے کرکٹ بھی کھیلا اور والی بال بھی، میں بہت خراب کھلاڑی تھا ہر کھیل میں شکست ملتی تھی۔ بس ایک دن قلم کو اپنا ہمنوا بنا لیا خود سے کہا کہ اب ہارنا منظور نہیں ہے صرف جیتنا ہے مجھے۔ جہاں تک ابا حضور کا تعلق ہے ابا حضور تعلیم کے محکمے میں بڑے عہدے پر تھے۔ گھر میں ایک بیمار دادی اماں تھیں، دادی اماں کو گٹھیا کا مرض تھا۔ ابا حضور کے تبادلے ہوتے رہتے تھے لیکن جب تک دادی اماں زندہ رہیں ابا ہمیں اپنے ساتھ کہیں لے کر نہیں گئے، یہ خوشیوں بھرے دن تھے۔ اسی گھر سے بہنوں کی ڈولیاں اُٹھی،

بھیا کی شادی ہوئی، اچھا کھانا پینا اور خالی وقت پھر کتابیں پڑھنا گھر کے تمام افراد کا مشغلہ تھا۔ اب یہ زمانہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی یہ زمانہ مجھے یاد آتا ہے پھر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ آج بھی امی جان سارے گھر میں دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ امی نے کبھی ہار ماننا نہیں سیکھا تھا۔ ابا تو زیادہ تر باہر رہتے تھے لیکن ہماری پرورش و پرداخت میں سب سے زیادہ ہاتھ امی کا رہا، خالی وقت میں امی کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔ امی ایک گھریلوں خاتوں تھیں لیکن امی کو پڑھنے لکھنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ امی کو میں نے زیادہ مذہبی نہیں پایا، وہ ایک سیکولر مزاج خاتون تھیں اور آپ سمجھ سکتی ہیں کہ اس زمانے میں سیکولر مزاج ہونا کتنا بڑا کام تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے آنکھیں کھولیں تو چاروں طرف شہر جل رہے تھے۔ اس زمانے میں دنگے فساد خوب ہوا کرتے تھے۔ میرا شہر بھی ان دنگے فسادات سے خالی نہیں تھا لیکن امی نے ہر بار کہا کہ جو لوگ بھی تمہارے ساتھ پڑھتے ہیں یہ سب تمارے دوست ہیں ان سب سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں بلکہ یہ سیاست ہے جو دنگے کراتی ہے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے کئی موقعے تھے جب میں نے امی کو بہت طاقت ور عورت کے روپ میں محسوس کیا اور یہ امی کی مضبوطی ہی تھی کہ امی ہر بار ناول لکھتے ہوئے مضبوط کرداروں میں شامل ہو جایا کرتی تھیں۔ امی سے وابستہ ہزاروں واقعات تھے ان واقعات کا تذکرہ کہیں نہ کہیں میری کہانیوں میں اور میرے ناولوں میں آیا ہے۔ جیسے 'نالہ شب گیر' کی وہ عورت جو سسٹم کے خلاف جنگ کرتی ہے اُس میں بھی امی کا عکس ہے اور اس لیے جب میں یہ بات کہتا ہوں کہ میری کہانیوں کی عورتیں کبھی کمزور نہیں ہوتیں تو دراصل ایسا کہنے میں میری امی جان کی تربیت کا ہاتھ ہے۔ جن کو میں نے آخری سانس تک کبھی کمزور محسوس نہیں کیا۔ باون، ترپین برس کی عمر میں امی کا انتقال ہو گیا لیکن انتقال سے قبل تک وہ یہی کہتی رہیں بلکہ وہ ہم تمام بھائی بہنوں سے کہتی رہیں کہ مضبوط بن کر جینا ہے کبھی ہارنا نہیں ہے وقت ایک جیسا نہیں رہتا وقت بدلتا رہتا ہے۔ امی جان سے جو تربیت ملی اُس تربیت نے ہم تمام بھائی بہنوں کو مضبوط بنایا۔

شافعہ: بچپن، لڑکپن اور جوانی کے احوال کا اظہارِ خیال کیجئے؟

ذوقی: جیسا بچپن عام طور پر بچوں کا ہوتا ہے ویسا بچپن میرا نہیں تھا اور جیسا کہ میں نے کہا کہ بچپن میں ہی کتابوں سے دوستی ہوگئی۔ میں ایک بہت خراب کھلاڑی تھا۔ بچپن میں کئی چیزیں کھیلی گلی ڈنڈا بھی کھیلا، کرکٹ بھی کھیلا، والی بال بھی، فٹ بال بھی لیکن میں ہر کھیل میں ہار جاتا تھا۔ میں بچپن سے ہی انتہائی شریف تھا اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میں کہانیاں لکھتا ہوں اور جو کہانیاں لکھتے ہیں اُن کو سنجیدہ ہونا چاہیے۔ بہت چھوٹی عمر سے میں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے وہ بچپن جس کو بچپن کہتے ہے وہ بچپن میرے ساتھ نہیں تھا۔ میں اگر ایک شعر میں کہوں کہ۔

پلک جھپکتے بڑھاپے میں پاؤں رکھتے ہیں
ہمارے عہد کے بچے جواں نہیں ہوتے

تو میں بچپن میں ہی جوان ہوگیا تھا اور بچپن میں ہی میں ایک سنجیدہ جوان میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہم لڑکپن کی باتیں کریں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ عمر بھی میں نے مطالعہ میں گزاری۔ مجھے بہت چھوٹی عمر سے ہی کتابوں کا شوق ہوگیا تھا۔ کھیل میں دل نہیں لگتا تھا، بھائی بہنوں کے ساتھ تھوڑی بہت شراتیں کرنا یا کھیلانا اس سے زیادہ نہیں اور آہستہ آہستہ کھیلوں سے بھی طبیعت گھبرانے لگی تھی پھر صرف کتابیں تھیں۔ میں اسکول جاتا تھا یا کالج جاتا تھا اور واپسی کے بعد صرف مطالعہ یہ میری زندگی کا حصہ تھا اور جہاں تک جوانی کی بات تھی ہاں یہ ضرور ہے کہ اہل شباب میں قدم رکھتے ہی کچھ رومانی واقعات میرے ساتھ ضرور پیش آئے۔ اُن میں ایک کہانی جو تبسم کے ساتھ شروع ہوئی وہ آج بھی جاری ہے۔ یعنی ہم نے لو میرج کی۔ تبسم نے بھی اس زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا اور میری کہانیاں اردو رسائل و جرائد میں شامل ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک دن مجھے ایک خط ملتا ہے اور اس خط میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ میں بھی کچھ لکھتی ہوں اور میں آپ کو بھیجنا چاہتی ہوں۔ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو اچانک مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ کہانی جو ایک لڑکی نے پتہ نہیں اپنے گھر کے کس گوشے میں بیٹھ کر لکھی ہے لیکن اس کہانی میں بہت زیادہ عکس میرا بھی شامل ہے۔ پھر میری گفتگو شروع ہوئی جب گفتگو شروع ہوئی تو اس وقت کی میری تمام تر کہانیاں یہ لڑکی پڑھ چکی تھی۔

یہ آغاز تھا اس کے بعد ہم لوگ آپس میں ملنے لگے اور ایک وقت ایسا آیا جب یہ خواہش ہوئی کہ اب دیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ اب ہم لوگوں کو ساتھ مل کر رہنا چاہیے تو اس زمانے میں میری امی کا انتقال ہو چکا تھا اور میری بڑی بہن مسرت جہاں ایک طرح سے امی کہ جگہ لے چکی تھی۔ میری آپا کو یہ پسند نہیں تھا کہ اس طرح کی کوئی لو میرج ہو اور میرا گھر، میری فیملی مذاق بن جائے۔ ظاہر ہے کہ بہت کچھ برداشت کرنا پڑا، میں دِلی آ چکا تھا اور اس کے بعد یہ ہوا کہ دلی میں ہی ہم لوگوں نے بہت خاموشی سے چند دوستوں کی موجودگی میں نکاح کیا۔ لیکن اس کے بعد خوشبو کی طرح یہ بات پھیل گئی اور یہ خبر ابا کو ہوگئی لیکن میرے گھر کا جو ماحول تھا وہ انقلابی تھا۔ ابا ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے بلکہ ابا بہت خوش ہوئے اور اس طرح سے اگر کہا جائے تو تبسم جو ہے وہ گھر آ گئی اور اس کے بعد آج کی زندگی ہے۔ یعنی کالج کا جو وقفہ رہا وہ میرے لیے عشق کا وقفہ بہت کم رہا بلکہ یہی وہ دنیا رہی جب مطالعہ، کتابیں بس یہی میری دوست رہی۔ میری زندگی اگر بچپن سے لے کر اب تک اگر دیکھا جائے تو میری زندگی میں ایڈونچر چیز کی بہت کمی رہی ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی ادب کے درمیان گزاری ہے۔ اس لیے آپ نے یہ جو تیسرا سوال کہا کہ بچپن کے وہ خاص واقعات .....واقعات تو بہت سارے ہیں لیکن یہ واقعات کچھ ایسے نہیں ہیں جن میں کوئی فلم ہو، کوئی ایڈونچر ہو کیونکہ میں نے بہت سادگی کے ساتھ اپنا بچپن گزارا، لڑکپن بھی بہت سادگی کے ساتھ گزارا اور بلکہ جوانی میں بھی عام طور پر جس طرح کے ایڈونچر لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں ایسا کوئی ایڈونچر جوانی میں پیش نہیں آیا ہاں دلی آنے کے بعد ایسے کئی واقعات ضرور ہوئے جن میں فلم بھی ہے ایڈونچر بھی ہے اور کچھ ایسے واقعات تھے جن کو اب لے کر میں اپنی آپ بیتی لکھ رہا ہوں۔ میری آپ بیتی کا نام ہے 'رات گزر رہی ہے' اس میں، میں نے تمام تر واقعات جو بچپن میں، لڑکپن میں اور جوانی میں پیش آئے میں نے اُن کو تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی۔

شافعہ: ذوقی صاحب آپ نے اپنے دوستوں، ہم جماعتوں اور اساتذہ کا ذکر نہیں کیا کہ ان کا آپ کی زندگی پر کیا اثر رہا؟

ذوقی: مجھے دوست بنانے کا شوق نہیں تھا اور میں نے کبھی دوست بنائے نہیں۔ جب ہم جماعت یا دوستی کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے صرف ایک ہی چہرہ یاد آتا ہے اور وہ چہرہ ہے میرے ایک دوست بہت پیارے دوست نجو کا چہرہ، نجو مجھ سے ایک کلاس سینئر تھے۔ وہ بھی آرہ میں رہتے تھے میں نے اپنا ایک ناول 'مسلمان' ان کے نام منسوب کیا تھا۔ جہاں تک اساتذہ کی بات رہی جن لوگوں نے مجھے پڑھایا اسکول میں یا کالج میں یا یونیورسٹی میں اُن میں سے کوئی ایسا نہیں رہا جن سے میں نے کچھ سیکھا ہو۔ لیکن ایک ایسا نام ہے جو میری زندگی کے سفر میں اب تک شامل ہے۔ جب پہلی بار مجھے مکتب میں بیٹھایا گیا جب پہلی بار ابا حضور نے کہا کہ کل سے تمہارے مولوی صاحب تم کو قرآن شریف پڑھانے کے لیے آئے گے۔ اس دن خوب بارش ہو رہی تھی مجھے آج بھی یاد ہے ڈر لگ رہا تھا میں چھوٹا سا بچہ تھا اور میں یہ بار بار سوچ رہا تھا کہ مولوی صاحب مت آئے۔ میں مولوی صاحب کی جگہ مولی صاحب کہا کرتا تھا لیکن تیز موسلا دھار بارش ہونے کے باوجود ہمارے مولوی صاحب تشریف لائے اور ان کا نام مولوی اسماعیل آفری تھا اب وہ بھی انتقال کر چکے ہیں۔ لیکن وہ جس طرز میں پڑھایا کرتے تھے جس طرح سے وہ سمجھایا کرتے تھے میری زندگی میں، میری تربیت میں اُن کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ اس کے علاوہ میری زندگی بالکل خالی رہی ہے اور جیسا میں نے کہا کہ میری زندگی میں کوئی بھی ایسے اساتذہ نہیں ہیں جن میں کچھ ایسی باتیں ہوں کہ میں اُن کے بارے میں اظہارِ خیال کروں۔ دوستوں کی بات رہی تو دوست آرہ نے ایک ہی دیا 'نجو' جس کو ٹوٹ کر چاہا۔ دلی آنے کے بعد جو لوگ ملے میں انھیں دوست کہہ سکتا ہوں چونکہ دوستی ایک ایسا جذبہ ہے جو آپ کے ساتھ ساتھ آخری سانس تک چلتا ہے۔ یہاں بہت اچھے دوست ملے جیسے اقبال جمیل صاحب جن سے میری دوستی ہوئی جو تاج اینکلو میں ہے۔ اُن کے احسانات ہیں مجھ پر، ایک ایسا شخص جو آج بھی کینسر کی جنگ لڑ رہا ہے، میں نے ان سے سیکھا ہے کہ جیا کیسے جاتا ہے میں نے ان سے سیکھا ہے کہ زندگی میں کبھی شکست تسلیم نہیں کرنی چاہیے میں نے ان سے سیکھا ہے کہ برے وقتوں میں بھی حوصلوں کو ہارنا نہیں ہوتا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ

اقبال جمیل صاحب کو میں اپنے دوستوں کی فہرست میں اول درجے پر رکھتا ہوں۔اس طرح سے اور بھی کئی لوگ ہیں ،میرے رشتہ دار بھی ہیں اور میں انھیں دوست کہہ سکتا ہوں ۔نعمان شوق جو اردو کے بہت اچھے شاعر ہیں،لیکن میرے دوستوں کا حلقہ بہت محدود ہے کیونکہ دلی آنے کے بعد میں نے بس ایک بات سیکھی کہ اگر مجھے لکھنا ہے تو مجھے محفلوں سے، دوستوں کی محفلوں سے دور رہنا ہوگا ۔شاید میں ان لوگوں میں شامل رہا ہوں جو دوستی پر بہت زیادہ یقین نہیں رکھتے ۔میں اپنے گھر میں خوش رہا میں نے کبھی دوست نہیں بنائے ۔ بہت پہلے میں نے ایک واقعہ پڑھا تھا یہ واقعہ بہت بڑے ادیب سارتر سے منسوب ہے ۔سارتر جس زمانے میں Iron In the Sol لکھ رہے تھے اُس زمانے میں وہ ایک ایسی جگہ چلے گئے تھے جہاں خوب برف بھاری ہو رہی تھی ۔ایک دن ان کا ایک فین ان سے ملنے آیا اس دن بھی برف بھاری ہو رہی تھی ۔اُس نے بیل پر ہاتھ رکھا !سارتر نے دروازہ کھولا پوچھا کہ ہاں صاحب فرمائیں .....ان کے فین نے کہا! کہ صاحب یہ دیکھیے برف بھاری ہو رہی ہے میں بھیگ چکا ہوں،لیکن یہ آپ سے محبت تھی کہ میں آپ سے ملنے کے لیے اتنی دور چلا آیا۔سارتر نے شکریہ ادا کیا اور دروازہ بند کر دیا۔بعد میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر میں اس طرح سے لوگوں سے ملتا رہتا تو میں Iron In the Soul کی تخلیق نہیں کر پاتا۔یہ وہ واقعات ہیں جو میری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے یہ وہ واقعات ہیں جنھوں نے مجھے زندگی دے دی اور جینا سیکھایا یہ وہ واقعات ہیں جنھوں نے مجھے بتایا کہ اگر جینا ہے اگر ادب میں کچھ کرنا ہے تو آپ کو محدود ہونا پڑے گا۔یہ وہ واقعات ہیں جنھوں نے مجھے بتایا کہ بہت پھیل کر لوگوں سے مل کر محفلوں اور نشستوں میں وقت برباد کرنا ہے اور آپ اچھا ادب تخلیق نہیں کر سکتے ۔ایسا نہیں کہ میں ملتا نہیں ہوں، میں آج بھی لوگوں سے ملتا ہوں لیکن میں اپنی حد میں رہتا ہوں میں زیادہ ملنے ملانے کی رسم پر یقین نہیں رکھتا۔تو یہ میری دوستوں کی باتیں تھیں ہم جماعت اور اساتذہ کی باتیں تھیں،ابتدائی تعلیم سے لے کر کالج تک کی باتیں تھیں ۔ میں نے بڑی خاموش ، پرسکون زندگی گزاری جس میں پتھر اُچھالنے کا کبھی کوئی ہل چل پیدا نہیں ہوا کیونکہ میں نے اپنی ساری زندگی

ادب کی آغوش میں گزاری۔

شافعہ: بہت خوب! ذوقی صاحب یہ بتائیں تبسم فاطمہ سے پہلی بار آپ کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ محبتوں کا یہ سلسلہ پھر شادی تک کیسے پہنچا؟

ذوقی: تبسم سے ملاقات کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ جب اچانک مجھے کالج میں پڑھنے والی ایک لڑکی کا خط ملا کہ 'میں بھی لکھتی ہوں اور میں آپ کو کہانی بھیجانا چاہتی ہوں' یہ شروعات تھی۔ امی جان کے بعد میری زندگی میں آنے والی مضبوط لڑکی تبسم تھی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میری مکمل زندگی پر امی کے ساتھ ساتھ اگر کسی کا اثر رہا ہے تو وہ تبسم۔ تبسم اپنی ذات میں ایک مکمل کائنات ہیں، تبسم نے مجھ سے زیادہ میرے ادب میں دلچسپی لی۔ ہماری شادی لو میرج تھی چند دوستوں کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن جب یہ خبر آرہ میں پھیل گئی تو ابا حضور نے کہا کہ نہیں صاحب کہ شادی تو ہونی چاہیے۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ شادی ضرور ہوگی لیکن ہم لوگ نکاح کر چکے ہیں اس لیے نکاح نہیں ہونا چاہیے۔ شادی آرہ میں دھوم دھام سے ہوئی تمام رسموں ورواج کے ساتھ ہوئی۔ ۱۹۹۱ء کا ماحول ہوگا جب ہم نے دلی میں شادی کی اور ۱۹۹۲ء میں آرہ میں۔ جب باضابطہ شادی ہوگئی رسموں ورواج کے ساتھ شادی ہوگئی تو میں تبسم کو لے کر دلی آ گیا۔ یہ میرے کشمکش کے دور تھے میں زندگی کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ میں نے اپنی کہانی 'بھوکا ایتھوپیا' میں تبسم کو پیش کیا ہے جب تبسم کہتی ہے کہ اگر آپ اجازت دے تو آپ کی زندگی کے ساتھ سر ملا کر میں بھی چلو اور اس طرح تبسم نے میرے لیے دوردرشن کا راستہ صاف کیا۔ تبسم کی نظر غضب کی تھی تبسم کا اپروج غضب کا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میری زندگی کو سوارنے میں سب سے بڑا ہاتھ تبسم کا رہا اور اس طرح وہ زندگی جو کشمکش سے بھری ہوئی تھی وہ زندگی جس میں جدوجہد ختم ہونے کا نام نہیں لینا چاہتی تبسم کے آنے کے بعد وہ زندگی اچانک میرے قابو میں آ گئی اور میں اس کو پوری طرح سے تبسم کی جیت کہتا ہوں کہ ادب کے علاوہ مجھے الیکٹرانک میڈیا میں لانے میں سب سے بڑا ہاتھ تبسم کا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صرف اور صرف دوردرشن کا چینل تھا اور کوئی چینل نہیں تھے، صرف دوردرشن دیکھا جاتا تھا۔

تبسم نے اپنی طرف سے بھی کوشیشیں شروع کیں اوراس طرح سے مجھے یاد ہے کہ شروع میں چھوٹے چھوٹے پروگرام ہوتے تھے،لیکن یہ پروگرام بھی اس وقت کے لحاظ سے اگر ہم پیسوں کی بات کریں تو بہت بڑے تھے۔پھر آہستہ آہستہ تبسم نے ارم پروڈکشن کے نام سے اپنا پروڈکشن ہاوس کھول دیا۔میں نے ذوقی کے نام سے اپنا پروڈکشن ہاس کھول دیا۔اس طرح سے ہم فلمیں بنانے لگے،دوردرشن کے لیے سیرئیل بنانے لگے۔پھر آہستہ آہستہ ہم نے منسٹری کے لیے فلمیں بنانے شروع کیے،ڈاکومنٹری فلمیں،ٹی۔وی ڈرامہ،سیرئیل اورتبسم آہستہ آہستہ کیمرے کے میدان میں،ڈائریکشن کے میدان میں بھی مہارت حاصل کرتی چلی گئیں۔یہ تبسم کا بدلا بدلا چہرہ تھا جو میں نے دلی آکر دیکھا اورایک بات میں اور کہوں تبسم کی بغاوت سب سے خاص ہے یعنی اگر کوئی آج بھی میرے بارے میں ایک غلط بات کہہ دے تو تبسم اس سے لڑنے کے لیے نکل جاتی ہے۔مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ تھا جب میں فسادات پر مشتمل کہانیاں لکھ رہا تھا ایک دن تبسم نے مسکراتے ہوئے کہا! کہ تمہاری نئی کہانیوں کا وقت آگیا اب فسادات بند ہو چکے ہیں اب سوشل کہانیاں لکھنا شروع کروں۔میں نے کہا کہ مجھے سوشل کہانیاں لکھنے کا ہنر نہیں ہے۔تبسم نے مسکرا کر کہا تم سوشل کہانیاں لکھنے میں زیادہ کامیاب رہوگے اور یہ بات حقیقت تھی یہ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے جو سوشل کہانیاں لکھیں وہ اردو کے لیے نئی کہانیاں تھیں۔میں ان کہانیوں میں زیادہ کامیاب ہوا جیسے ''صدی کو الوداع کہتے ہوئے''،''باپ بیٹا''،''فریج میں عورت''،''فزکس کمسٹری الجبرا''، ''بیٹی'' یہ تمام کہانیاں اگر آپ دیکھے یہ کہانی بھی نئی کہانیوں کو مجھ سے زیادہ تبسم کی جیت بتاتی ہے کیونکہ مجھے ان کہانیوں میں لانے کا سہرا ہی تبسم کا تھا۔

شافعہ: اپنے بچوں کے بارے میں بتائیں؟ کیا آپ کے بچے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ کیا رائے ہے ان کی کبھی بات ہوتی ہے؟

ذوقی: میرا ایک ہی بیٹا ہے بیٹے کا نام عکاشہ عالم ہے ابھی اس کی عمر ۲۲ سال ہے۔میری ایک چھوٹی سی بیٹی بھی تھی لیکن بیٹی کا انتقال اس وقت ہوا جب اس کی عمر ۲ برس تین مہینے کی تھی۔میں اپنے بیٹے

کو ساشا کے نام سے پکارتا ہوں، ساشا ایک ذہین بچہ ہے۔ میرے گھر میں چاروں طرف کتابیں ہیں۔ مجھے یاد ہے ان کتابوں سے کبھی کبھی میرے بھانجے بھانجی گھبرا جاتے تھے یہ گھر ہے یا لائبریری۔ میرا بیٹا جب گیارہ سال کی عمر کا تھا، ایک دن وہ میرے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اس وقت میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میرے بیٹے کی عمر اس وقت اتنی کم تھی کہ مجھے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کیا کہنے والا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا مسکرا کر پوچھا کوئی کام ہے کیا؟ ساشا نے میری طرف دیکھا اور ناراضگی بھرے لہجے میں بولا کوئی کام نہیں ہے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں بھی بڑا ہو کر آپ کی طرح کہانیاں لکھوں گا تو یہ سچ نہیں ہے، میں نہ اردو میں لکھوں گا نہ انگریزی میں۔ میں اس کی معصومانہ باتوں پر مسکرا دیا، بیٹے کی طرف دیکھا اور صرف اتنا کہا کہ یہ فیصلہ تم ابھی نہیں کر سکتے یہ فیصلہ وقت کرے گا۔ اب میرا بیٹا ۲۲ برس کا ہے۔ اس نے انگریزی میں گریجویشن کیا ہے وہ میڈیا میں کچھ کر دکھانا چاہتا ہے۔ وقت تبدیل ہو چکا ہے میرا بیٹا اچھے ادب کو پڑھنا اور اچھی فلمیں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ہم اکثر دو دوستوں کی طرح بدلتے ہوئے سماج، تبدیل ہوتی ہوئی سیاست اور موجودہ منظرنامے پر دل کھول کر بات کرتے ہیں۔ جہاں تک آئیڈیلوجی یا نظریہ کی بات ہے میرا بیٹا ترقی پسند فکر سے تعلق رکھتا ہے وہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے۔ اکثر جب ہم اردو کہانیوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں تو وہ مغرب کی مثالیں دے کر بیٹھ جاتا ہے پھر کہتا ہے کہ آپ لوگ اب تک ناسٹلجیا کے شکار ہیں آپ کا ادب اب تک محدود دائرے سے باہر نہیں نکلا ہے۔ میں اگر اپنے گھرانے کی بات کروں گھرانے کے بچوں کے بارے میں بات کروں تو میری چھوٹی بہن زینت زماں کا بیٹا صہیب زماں کی فکر بھی ترقی پسندانہ ہے۔ صہیب آج کل آسٹریلیا میں رہتا ہے۔ میرے گھرانے میں صہیب واحد بچہ ہے جس کو لکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے۔ ان دِنوں وہ انگریزی میں ایک ناول بھی لکھ رہا ہے۔ موجودہ سیاست پر لمبے لمبے پوسٹ لکھ رہا ہے یہ اس کی ایک عادت ہے لیکن اس کی ہر پوسٹ میں ترقی پسندانہ زاویے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میرا بیٹا بھی ترقی پسندانہ اصولوں کی پیروی

کرتا ہوا مستقبل میں امن اور شانتی کا متلاشی ہے۔ اِسی لیے میں یہ آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ ادب کا دروازہ میرے گھر میں مشرف عالم ذوقی تک آ کر بند نہیں ہوتا بلکہ یہ دروازہ نئی نسل کے دو بچے صہیب اور ساشا نے مل کر کھول دیا ہے۔ ادب سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

شافعہ: اپنی تخلیقی کیفیت کے بارے میں بتائیں؟ آپ کے ہاں جو اظہار کا عمل ہے اس میں آپ اپنی تخلیقی عمل کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں یا دسترس یا پھر مہارت کو؟

ذوقی: تخلیقی کیفیت کا مسئلہ الگ ہے کیونکہ تخلیق کرتے وقت ایک مخصوص کیفیت ہوتی ہے۔ میں دوسروں کی تخلیقی کیفیت کے بارے میں نہیں جانتا لیکن اپنی تخلیقی کیفیت کو میں کوئی نام دینے سے قاصر ہوں۔ میری کیفیت مختلف تجربوں سے آشنا ہوتی ہے۔ اب ذرا ٹھہر کر تخلیقی کیفیت، تجربے اور آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں باتیں کرلوں ہماری گول گول گھومتی دنیا کے آگے بھی کئی سوالیہ نشان لگا دیے ہیں۔ ایک طرف ارتقاء کی ریس دوسری طرف گریٹ ڈپریشن کی شکار اکانومی، جنگ عظیم کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، بڑھتی ہوئی دہشت گردی، تاریخ کے ساتھ سیاست کا جبر، مذہب کی بالادستی بھی اور ایک دوسرے کے مذاہب پر شبِ خون مارنے کی تیاری بھی۔ ہم ایک نئے جراسک پارک میں تضاد اور کنفیوژن کا شکار ہو کر بونگے ہو چکے ہیں۔ معیشت تباہ ہو رہی ہے اور نئے سماجی و سیاسی رویے پروان چڑھ رہے ہیں۔ ہم تہذیبوں کو بچانے، ماحولیات کے تحفظ کی باتیں کرتے ہیں اور جغرافیائی سطح پر ہماری زمین کم ہوتی جاری ہے۔ کلوننگ پروسس، ڈی ان اے کی نئی تہذیب اور موت پر فتح پانے کے چیلنجز کے باوجود ہم بڑھتی ہوئی دہشت گردی سے پریشان ہیں۔ خوف کے اندیشے میں برطانیہ اور امریکا جیسے ممالک مل کر کچھ معصوم تاناشاہوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ چھوٹے ممالک بڑے مچھلیوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ بچوں اور عورتوں میں عالمی سطح پر آنے والی تبدیلیاں بھی ہیں۔ ظاہر ہے ناول تخلیق کرتے وقت میں کن کیفیات سے گزرا یہ بتانا مشکل ہے۔ دسترس اور مہارت ایک الگ چیز ہے، کہانی کے لیے سب سے پہلے آپ کا Vision، آپ کا

نظر یہ آتا ہے۔

شافعہ: ناول کے بنیادی تخیل کو کاغذ پر منتقل کرنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے؟

ذوقی: ایک ناول کو مکمل کرنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے یہ بتانا مشکل ہے۔ 'آتش رفتہ کا سراغ'' کو مکمل کرنے میں پندرہ سال لگ گئے ۔ میں ناول شروع کرنے سے پہلے کافی ہوم ورک کرتا ہوں۔اس لیے ناول کی تخلیق میں وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔

شافعہ: آج کل آپ کون سا ناول یا افسانہ لکھ رہے ہیں؟

ذوقی: ان دِنوں میں تین ناولوں پر کام کر رہا ہوں۔دو ناول تقریباً مکمل ہو چکے ہیں۔تیسرے ناول پر بھی ابھی کام چل رہا ہے۔میرے کام کرنے کا طریقہ مختلف ہے۔میرے لیے ذہن ایک کمپیوٹر ہے۔اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ایک وقت میں کئی ناولوں پہ کام کرتے ہیں۔ میں اُن سے ایک بات کہتا ہوں نمبر ایک میں نوٹس تیار کرتا ہوں۔آپ جب میرے ناول کے کام کو دیکھیں گے تو اس بات کا احساس ہوگا کہ ناول جہاں تک میں نے لکھا ہے اس کے بعد ایک نوٹ لکھا ہوا ہے کہ مجھے آگے یہ لکھنا ہے۔دوسری بات ذہن کی Floppy میں اپنے تمام موضوعات کو فٹ کر دیتا ہوں اس لیے جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو مجھے آسانی ہوتی ہے۔ان دِنوں جو دو ناول تقریباً مکمل ہو چکے ہیں۔میں اُن کے بارے میں کچھ بتانا چاہوں گا۔میرا ایک ناول ''اردو'' ہے۔ ''اردو'' عنوان ہے ''اردو'' جو ناول ہے یہ ایک ہزار برس کی کہانی ہے اب سوال ہے کہ میں نے 'اردو' کا انتخاب کیوں کیا۔یہ ناول ۵۰۷ صفحات پر مشتمل ہیں یعنی ایک بڑی دنیا اس ناول کا حصہ ہے۔میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ محمد بن قاسم سے لے کر چاہے وہ غزنوی ہوں، خلجی ہوں، مغل بادشاہوں کی حکومت رہی ہو۔مسلمانوں کے ہزار برسوں کے سفر کو جس طرح سے دیکھا گیا ہے یا جس طرح سے آج کے ماحول میں مسلمانوں کی کردار کشی ہو رہی ہے تو میرا خیال تھا کہ ایک ایسے موضوع کو اُٹھایا جائے جس سے مسلمانوں کی سچی تصویر سامنے آسکے۔

شافعہ: آپ نے ایک ناول ''مسلمان'' کے نام سے بھی لکھا ہے۔آپ کو یہ ناول شائع کرتے وقت

خوف محسوس نہیں ہوا۔اس ناول کے ردعمل میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں پر کیا اثر رہا؟

ذوقی: ''مسلمان'' میں ہندو مسلمانوں کے درمیان کوئی ایسی فضا نہیں ہے جسے خوف کا احساس ہو بلکہ یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم ہمیشہ سے ہی بھائیوں کی طرح رہتے آئے۔ ہماری وراثت گنگا جمنا رہی ہے اور اس وراثت کو کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ''مسلمان'' بیان اور آتش رفتہ کا سراغ کے پہلے کی کڑی ہے اور اس ناول میں جس اندیشے کا اظہار کیا گیا ہے وہ اندیشہ آتش رفتہ کا سراغ تک آتے آتے خوف ناک شکل میں تبدیل ہونے والا یعنی دہشت اور وحشت کا وہ رس بھی دیکھا جس کو دیکھنے سے قبل اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ کاش یہ آنکھیں بند ہوگئیں ہوتیں۔ تو'' مسلمان'' ایک پڑاؤ تھا جو میں نے آزادی کے بعد ملک میں پھیلتی ہوئی نفرت کو محسوس کیا اور یہ ناول لکھنے پر مجبور ہوا۔

شافعہ: مغرب میں ناول نگار اپنے موضوع کی تلاش میں دور دراز کے مقامات کا سفر کرتے ہیں۔کیا آپ نے کبھی ایسا کیا؟

ذوقی: صرف مغرب کے ناول نگار کیوں! یہ تلاش ہر اس ادیب میں ہونی چاہیے، اُس ناول نگار میں ہونی چاہیے جو ناول لکھ رہا ہے۔ میں تامل، ملیالم، بنگالی، تیلگو کے کئی ایسے ناول نگاروں سے واقف ہوں جو ڈرائنگ روم میں بند ہو کر ناول نہیں لکھتے تھے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں بھی اُن لوگوں میں سے ایک ہوں جو گھر کے ڈرائنگ روم میں بند ہو کر ناول نہیں لکھتا۔ناول ایک اپروچ ہے، ناول ایک وژن کا نام ہے، ناول میں ہم جس شہر کا تذکرہ کرتے ہیں جن کرداروں کو لے کر سامنے آتے ہیں تو یہ کردار ہوا میں معلق نہیں ہیں یہ شہر بھی ہوا میں معلق نہیں ہیں۔اس شہر کی اپنی ایک تہذیب ہوسکتی ہے اور تہذیب ہوتی ہے تو جب اس تہذیب کو دکھانے کا وقت ہے جس کے لیے میں یہ ناول لکھ رہا ہوں تو مجھے اس شہر میں جانا ہوگا۔ میں ایک بات بار بار کہہ چکا ہوں کہ مطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ ساتھ ناول لکھنے کے لیے سیاحت بھی ایک ضروری پڑاؤ ہے۔یعنی اگر آپ سیاح نہیں ہے، اگر آپ دور دراز ملکوں کا دورہ نہیں کرتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ آپ کوئی بڑا ناول

تخلیق نہیں کر سکتے ہیں ۔آپ اردو میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں کو دیکھئے قرۃ العین حیدر جب ناول لکھتی ہیں تو سری لنکا کا بھی تذکرہ ہوتا ہے،لندن کا بھی تذکرہ ہوتا ہے، پیرس کا بھی تذکرہ ہوتا ہے اور صرف تذکرہ ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہاں کی خوبیاں، خامیاں، تہذیب ان ساری چیزوں کو قرۃ العین حیدر بتا بھی دیتی ہیں۔تو ناول لکھنا ایک آرٹ ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو ناول لکھے ان کی زمین ہندوستانی ہے۔ جو بھی ناول لکھے لیکن یہ ناول الگ الگ علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے 'لے سانس بھی آہستہ' کی زمین بلند شہر ہے۔'لے سانس بھی آہستہ' کی تخلیق کے دوران میں نے کئی بار بلند شہر کا دورہ کیا تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایسا مغرب والے نہیں کرتے ہیں۔ ناول کا کینوس بہت بڑا ہوتا ہے ۔کہانی ایک چھوٹے سے واقعات تک محدود ہے لیکن ناول کے لیے آپ کو تمام حدوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہت بڑا کینوس ہوتا ہے تو اس بڑے کینوس کو دیکھنے کے لیے آپ کو اُن مقامات تک جانا ہوتا ہے اور اس طرح کے ناول ڈرائنگ روم میں کبھی نہیں لکھے جا سکتے۔اس لیے ایسا نہیں ہے کہ صرف جو مغربی ناول نگار یا مصنف ہیں، وہیں گھومتے ہیں۔ ہمارے عام ادیبوں کو بھی گھومنا ہوتا ہے، جانا ہوتا ہے، دیکھنا ہوتا ہے تب جا کر کردار پیدا ہوتے ہیں، تب جا کر بہت سارے واقعات اکھٹا ہوتے ہیں، تب جا کر خاموش شہر کو ایک صحیح مقام اپنے ناول میں دے پاتے ہیں۔

شافعہ: انگریزی کے کسی مشہور ادیب نے کہا تھا کہ وہ نظم وضبط کے ساتھ لکھتے ہیں؟ آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟

ذوقی: سب سے پہلے یہ کس ادیب نے کہا تھا کس نقاد نے کہا تھا یہ حوالہ آپ نے کہا سے لیا۔ ہر ادیب نظم وضبط کے ساتھ ہی لکھتا ہے اور جو نظم وضبط کے ساتھ نہیں لکھتا اس کی کہانیاں بکھر جاتیں ہیں، اس کے واقعات بکھر جاتے ہیں۔ جو نظم وضبط کے ساتھ نہیں لکھتا ہے وہ دوسرے یا تیسرے درجے کا مصنف ہوتا ہے اور دوسرے یا تیسرے درجے کے مصنف کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔اس لیے جو بھی اچھا مصنف ہوگا وہ بہت صبر کے ساتھ، نظم وضبط کے ساتھ ہی ناول لکھنے کی سعی کرے

گا۔

شافعہ: اچھا ذوقی صاحب اردو فکشن کی موجودہ صورتِ حال پر آپ کیا کہنا چاہے گے؟

ذوقی: یہ بھیانک سوال ہے بھیانک اس لیے ہے کہ اس وقت بہت اچھا بھی لکھا جا رہا ہے اور بہت برا بھی لکھا جا رہا ہے۔ جب میں ہندوستانی سطح پر دیکھتا ہوں اور اردو فکشن کا جائزہ لیتا ہوں یا اردو ناولوں کا جائزہ لیتا ہوں تو دو طرح کی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ہمارے کچھ لوگ اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہیں۔ ابھی بھی از کچرے فلسفوں سے کھیل رہے ہیں اور دوسری طرف ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جس نے ابھی بھی ناول یا فکشن کی زمین کو محسوس نہیں کیا ہے۔ ناول یا فکشن کی زمین کے لیے جس سنجیدگی کی ضرورت ہے وہ سنجیدگی اس کے پاس نہیں ہے۔ میں ذرا سی اپنی بات میں اضافہ کروں کہ ناول اور فکشن ہوا میں تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو فٹ نوٹس لینے ہوتے ہیں، آپ کو ایک بڑی دنیا کا انتخاب کرنا ہوتا ہے اور اس کے لیے آپ کے وژن، آپ کے نظریہ کا پختہ ہونا ضروری ہے۔ ہندوستانی سطح پر ان دنوں بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں لیکن مجھے وژن نظر نہیں آتا، لیکن مجھے وہ گہرائی نظر نہیں آتی۔ میں کشمیر کو دیکھتا ہوں اور اس بات پر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کشمیری ناول نگار اور افسانہ نگاروں نے اُس کشمیر کو دیکھا ہی نہیں جو کشمیر اُن کے سامنے ہے۔ کشمیر اگر ہندوستان کا حصہ ہے اور ہے تو ہمارے ادیبوں نے بھی کشمیر کو نہیں دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موجودہ فضا میں سب کی آنکھیں بند ہے اور ہم بند آنکھوں سے لکھ رہے ہیں۔ بند آنکھوں سے کبھی ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ اس وقت ہم مردہ روایات کا حصہ بن گئے ہیں جب تک ہم اس مردہ روایات سے باہر نہیں نکلتے ہیں تب تک اچھا ادب تخلیق نہیں ہوگا لیکن یہ بات صرف ہندوستان کی حد تک ہے۔ میں ذرا آگے بڑھتا ہوں تو مجھے اردو فکشن اور اردو ناول نگاری میں بہت اچھے امکانات نظر آتے ہیں۔ پاکستان میں بہت عمدہ لکھا جا رہا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ، لال چودھری، رضیہ فصیح احمد، نگہت سلیم، اسد محمد خان ایک دو نہیں بہت سے نام ہیں جو بہت عمدہ لکھ رہے ہیں جن کو اس بات کا خیال ہے کہ یہ دنیا اس وقت کہاں جا رہی ہے جن کو اس بات کا خیال ہے کہ ہمارے مسائل ہمارے عالمی

مسائل کتنے گہرے ہو چکے ہیں۔جنہیں اس بات کا خیال ہے کہ امریکا کیسا تاناشاہ ہے،فلسطین کیوں جل رہا ہے،افغانستاں کیوں برباد ہوا۔تو یہ جو عالمی صورتحال ہے ہندوستاں والے تو بالکل الگ ہیں وہ تو دیکھ ہی نہیں رہے ہیں وہ تو ہندوستان کے چار برسوں کو بھی نہیں دیکھ رہے ہیں تو کیسا ادب ہے تو اس لیے آپ کے سوال کا جواب بہت آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔ بہت خراب لکھا جا رہا ہے، ہمارے یہاں کچھ لوگ ہیں جو ابھی بھی فلسفوں سے کھیل رہے ہیں۔دو طرح کا تصور پایا جاتا ہے اور مجھے ابھی ہندوستانی سطح پر کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ ہم کوئی بڑا ادب تخلیق کر سکے۔

شافعہ: پریم چند کے بعد اردو فکشن میں کون سی تبدیلی آئی ہے؟

ذوقی: پریم چند کے بعد تو اردو فکشن میں بہت سی تبدیلیاں آئی۔آب یہ دیکھئے کہ اگر ہم پریم چند کا زمانہ دیکھیے تو یہ زمانہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس کا زمانہ ہے اور آج ۲۰۱۸ء چل رہا ہے۔ پریم چند ہمارے Pioneer ہیں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند نے افسانے کی بنیاد رکھی۔پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے Pioneer ہیں۔یعنی ہندی افسانے کی شروعات بھی پریم چند نے باضابطہ طور پر کی اور اردو افسانے کی شروعات بھی باضابطہ طور پر پریم چند نے کی۔ جب کہ اس وقت تک اردو میں سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، راشد الخیری اور کئی ایسے ادیب سامنے آ چکے تھے۔لیکن اس کے باوجود بھی پریم چند نے جس نظم وضبط کے ساتھ افسانے لکھے، ناول لکھے تو فکشن کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی۔اسی طرح 'مرأۃ العروس' ۱۸۶۹ء میں آ چکا تھا۔لیکن باضابطہ طور ناول کی بنیاد بھی پریم چند نے ہی ڈالی تھیں۔ پریم چند جس دور میں آئے وہ دور غلامی کی بندشوں میں جکڑا ہوا تھا۔غلام ملک تھا، فرسودہ روایات چل رہی تھیں۔ پریم چند اتنے بڑے افسانہ نگار تھے کہ انہوں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ کھڑا ہونا ہوگا۔ایک سو اٹھارہ برسوں کی افسانوی سفر میں مجھے ایک ہیرو نہیں ملتا پریم چند کی طرح جو کسانوں کے جلسے میں گیا ہو اور جس نے مزدوروں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہو اور ان کے مسائل حل کیے ہوں۔ پریم چند جیسا کوئی نہیں ہاں اسلوب، ہیئت میں، موضوعات میں پریم چند کے بعد تبدیلی آتی رہی۔ پریم

چند سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو ۱۹۳۴ء ''انگارے'' آچکی تھی۔انگارے ایک آگ تھی، بغاوت کی آواز تھی۔دس نوجوان تھے جنھوں نے انگارے کے ذریعے ایک خاص نظریہ کو ایک مخصوص نظریے اور اپنے وژن کو اپنے احتجاج کو آگے بڑھایا۔اس لیے ہوا یہ کہ انگارے پر بندش لگ گئی۔ ''انگارے'' کو پڑھنا معیوب سمجھا گیا۔۱۹۳۶ء تک آتے آتے ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی جا چکی تھیں۔تبدیلی آ گئی تھی احتجاج ہو رہے تھے، غلامی کے خلاف بھی، آزادی کے لیے بھی، ادیب ایک پلیٹفارم پر جمع ہو گئے تھے اور احتجاج ہو رہا تھا۔منٹو جیسا افسانہ نگار سامنے آیا، عصمت چغتائی سامنے آ گئیں۔اسی زمانے میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار بھی پیدا ہوئے۔یعنی تبدیلی آ چکی تھیں اگر آپ دیکھئے تو یہ چار اہم ستون ہیں۔کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو اور بیدی اور ان چار ستون کے بغیر ہم اردو افسانے کا تذکرہ نہیں کر سکتے لیکن ان کے موضوعات مختلف تھے، اسلوب مختلف تھا دنیا کو دیکھنے کا جو زاویہ تھا وہ مختلف تھا۔ہم ذرا سا آگے بڑھتے ہیں تو ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کا غلبہ ہو چکا تھا۔ترقی پسندی کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔اسے پروپیگنڈہ کہا جا رہا تھا۔جدیدیت نے ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک حکومت کی۔نئی تحریک تھی، تجریدی افسانے لکھے گئے، علامتی افسانے لکھے گئے، مبہم افسانے لکھے گئے اور ۱۹۸۰ء تک آتے آتے یہی کہا جانے لگا کہ اردو افسانوں کا قاری گم ہو چکا ہے۔۱۹۸۰ء کے بعد قاری کی بازیافت ہوئی، بیانیہ کی واپسی ہوئی، کہانی نئی شکل میں سامنے آنے لگی۔اب موضوع بدل گئے تھے۔۱۹۸۰ء تک موضوع بہت حد تک غلامی، تقسیم اور ہجرت کے اردگرد سفر کر رہا تھا۔اب موضوعات میں نیا ہندوستان بھی تھا۔میں نے 'بیان' لکھا جو بابری مسجد کے تعلق سے تھا۔پیغام آفاقی نے 'مکان' لکھا، غضنفر اپنے ناول 'پانی' کو لے کر سامنے آئے۔یعنی صورت حال تبدیل ہو رہی تھی۔بیس سالوں میں یعنی ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء تک یہ دنیا بہت حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔اس دنیا میں دہشت پسندی آ گئی تھی، اس دنیا میں عالمی سطح پر ایک بکھراؤ پیدا ہو گیا تھا۔دوسری تیسری جنگِ عظیم کے بعد ایک ایسا ماحول تھا جہاں ہر سال کہیں نہ کہیں بم گر رہے تھے۔ایک ایسا ماحول تھا جہاں بڑی طاقتیں بڑی

مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو مسلسل کھا رہی تھیں ۔ان کا اقرار بھی ہماری کہانیوں میں ہو رہا تھا۔ ہندوستان سے پاکستان تک جو کہانیاں لکھی جارہی تھیں ۔اُن میں کہیں نہ کہیں عالمی مسائل آرہے تھے۔۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۸ء تک آتے آتے یہ دنیا بہت حد تک تبدیل ہو چکی تھیں ۔اگر آپ ۲۰۰۰ء کو دیکھتے ہیں تو ۳۱ دسمبر کے بعد جب رات کے بارہ بجے کا وقت تھا دنیا کے تمام کمپوٹر بیٹھے یہ Y2K کا دور تھا۔سارے کمپوٹر بیٹھ گئے اور معاشرے میں ہمارے سیاسی ،سماجی ڈھانچے میں ایک انتشار برپا ہوا۔۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۸ء تک ہم نے ایک نئے انقلاب کو دیکھا ہے۔۲۰۰۰ء کے بعد اگر آئے تو ہندوستان اور پوری دنیا ایک نئے تصور میں سانس لے رہی تھی۔ یہاں بھی وہی بڑی مچھلیاں ہیں چھوٹی مچھلیوں ہیں۔ملکوں کو تباہ کر دیا جاتا ہے افغانستاں کو تباہ کر دیا گیا،عراق کو تباہ کر دیا گیا یہ بڑا کھیل تھا۔ادب اپنی ذمہ داریوں سے آگے نہیں ہوسکتا۔ ادب کا اختلاف ایسی ہی باتوں پر ہوتا ہے۔تو پریم چند سے ہوتا ہوا ادب ۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۸ء کے درمیان تک بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ پاکستان کے ایک مشہور ناقد ہے مبین مرزا کے افسانوں پر ان کا ایک مضمون کچھ دن پہلے میرے مطالعے میں آیا تھا۔انہوں نے لکھا کہ موجودہ فکشن کو پیش کرنے کے لیے بہت سے مسالے چاہیے۔اور یہ سچائی ہے پہلے صرف بیانیہ تھا لیکن اس کمپلیکس دور میں ،اس الجھے ہوئے دور میں محض بیانیہ کے سہارے نہ ایک اچھا افسانہ لکھا جاسکتا ہے نہ ایک اچھا ناول لکھا جاسکتا ہے۔ فنطاسی چاہیے، علامتیں چاہیے، تضادات تھے ہماری دنیا تضادات میں گر گئی ہے۔تو اب کہانیاں صرف اور صرف بیانیہ میں سفر نہیں کرسکتی ہیں۔ان تضادات کو دکھانے کے لیے آپ کو فنطاسی کی دنیا میں، علامتوں کی دنیا میں جانا ہوگا تو بہت سے مسالے چاہیے اور مجھے لگتا ہے کہ پریم چند سے ۲۰۱۸ء تک اردو افسانے نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے، بہت سے تجربے کیے ہیں اور آئندہ بھی نئے نئے تجربے ہوتے رہے گے۔

شافعہ: معاصر افسانہ اور ناول نگاروں میں آپ کن کو اپنے ساتھ محسوس کرتے ہیں؟

ذوقی: جب ہم اردو کہتے ہیں تو اردو کا مطلب صرف ہندوستان نہیں ہوتا اردو کا مطلب صرف

پاکستان بھی نہیں ہوتا اردو کا مطلب عالمی برادری سے ہے اور اس بات کی خوشی ہے کہ اردو کو مردہ تصور کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ اردو آہستہ آہستہ مغرب میں پھیل چکی ہے۔ آج سوشل ویب سائٹس کا دور ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اردو چین میں جاپان میں پیرس میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہندوستانی سطح پر جو معاصر ہیں شاید میں ان سے اتفاق نہیں رکھتا لیکن ابھی بھی پاکستان اور پاکستان سے باہر ایسے کئی ادیب ہیں جن سے میں متاثر ہوں۔ میں مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں سے بے حد متاثر ہوں اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تارڑ صاحب کے تمام ناولوں کا مطالعہ کیا ہے۔ میں رضیہ فصیح احمد کے ناولوں سے بہت متاثر ہوں۔ اس طرح سے پاکستان میں جو نئی کھیپ آئی ہے جس میں بہت سے نام ہیں میں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا بہت سے لوگ ہیں جو ناول لکھ رہے ہیں اور کئی ایسے ناول ہیں جنھوں نے پہلی قرات میں مجھے بھی چونکایا ہے۔ اس لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے، روشن ہے اور آج بھی بہت عمدہ بہت اچھے افسانے اور بہت اچھے ناول لکھے جا رہے ہیں۔

شافعہ: آپ اپنے فکشن میں ایک نظریہ (Theory) پیش کرتے ہیں۔ آپ کی یہ تھوری معاشرے میں یا سماج کس حد تک قابلِ قبول ہوتی ہے؟

ذوقی: یہاں یہ بات سمجھنے ہوگی کہ ہمارے جو ادیب ہیں جو ناول نگار ہے اور جو افسانہ نگار ہے وہ مبالغ نہیں ہوتا اور وہ سماج سدھارک بھی نہیں ہوتا، ریفارمسٹ بھی نہیں ہوتا۔ ہم نئی تھوری ضرور دیتے ہیں اور اس لیے دیتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک دنیا ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے ایک انسانی زاویہ ہوتا ہے۔ جس دن پہلی بار میں نے اپنے ہاتھوں میں قلم اُٹھایا تھا تو پھر سارے مذہب کا احترام میرے لیے فرض بن گیا تھا اگر میں کسی ایک مذہب پر قائم رہ کر لکھتا تو شاید میں انصاف نہیں کر پاتا۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تھوری یا جو نظریہ ہم اپنے ناولوں یا کہانیوں میں دینے کی کوشش کرتے ہیں اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں ایک بڑی انسانی برادری بھی ہوتی ہے۔ آج اس انسانی برادری کو ہم لہولہو دیکھ رہے ہیں تو اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے ایسا کب تک

چلے گا ہمارا رول کیا ہوسکتا ہے۔ ہم تو لکھنے والے ہیں ہم سیاست دان نہیں ہیں ہم انتظامیہ نہیں چلاتے ہیں۔ ہمارا کردار بہت چھوٹا سا کردار ہے اور ہمارا کردار بہت حد تک سمٹ چکا ہے۔ سمٹ اس لیے چکا ہے کہ ۲۰۱۸ء آتے آتے بہت حد تک صرف اردو زبان نہیں ہندی زبان نہیں ہندوستانی زبان نہیں بلکہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں سے قاری گھم ہونے لگے۔ یہاں ایک بات کی طرف اشارہ اور بھی کروں کہ ۲۰۱۸ء آتے آتے کئی بڑی زبانیں مر چکی ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ شاید آئندہ آنے والے دس برسوں میں اردو زبان بھی نہ رہے یہ کہاں جا رہا ہے یہ شک وشبہات ہیں میں اردو زبان کے زندہ رہنے کی دعا کرتا ہوں لیکن یہ باتیں میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ جو شک وشبہات ہیں یہاں بھی ایک نظریہ ہے جو کہیں نہ کہیں ناول اور فکشن کے لیے کام کرتا ہے اور جیسا میں نے بتایا کہ میں ایک ناول لکھ رہا ہوں ''اردو'' تو 'اردو' میں، میں نے اردو کلچر کو دکھانے کی کوشش کی ہے تو ہر بڑا ناول نگار اپنے طور پر کہیں نہ کہیں کسی نظریہ اور تھوری کے ساتھ ضرور چلتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کی رسائی سامنے والے تک ہو۔ لیکن ایسا متوقع نہیں ہے کہ آپ کی تھوری سے کوئی زلزلہ آجائے آپ کی تھوری سے کوئی بغاوت کی فضا پیدا ہو جائے آپ کی تھوری سے کوئی انقلاب آجائے ایسا نہیں ہوتا ہے ہم محض اپنا کام کرتے ہیں ہم ایک تھوری کو اپنے قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بات کی امید کرتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں ہمارا وژن، ہمارا لکھنا لوگوں تک پہنچے گا اور لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے کام بھی آئے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادیب کو مقصدی ادب لکھنا چاہیے میں مقصدی ادب لکھنے کے بالکل خلاف ہوں۔

شافعہ: اکثر آپ حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ایسی باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جو اخلاقی نظام کے خلاف ہوتی ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ذوقی: ادب کا تعلق بہت حد تک اخلاقیات سے ہوتا بھی نہیں ہے۔ ہم اگر ہندوستانی اخلاقیات کی بات کریں تو وہ کون سا پیمانہ ہے جس کے تحت آپ ہندوستانی اخلاقیات کو دیکھنے کو کوشش کرے گے، وہ کون سا پیمانہ ہے جس کے تحت آپ مغربی اخلاقیات پر روشنی ڈالے گے۔ اخلاقیات ایک

مبہم چیز ہے اور جس طرح سے آج ہو رہا کہ ہم فلموں میں، ادب میں اخلاقیات کو تلاش کرتے ہیں مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی ایک گمراہ کرنے والی بات ہے۔ مغرب کے ایسے کئی ناول ہے جن کو اگر آپ پڑھے تو پھر آپ کو ایسا لگے گا جیسے اس میں تو اخلاقیات کے پرکھے اُڑ گئے ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتادوں کہ ایک بہت بڑا رائٹر تھا بلکہ سب سے بڑا رائٹر کہا جاتا ہے James Joyce نے جب Ulysses لکھا تو اس پر Porongraph کا مقدمہ چلا۔ جج نے مقدمے کے فیصلے سے قبل یہ کتاب کچھ ایسی عورتوں کو پڑھنے کے لیے دی جن کے بارے میں معاشرے میں یہ بات عام تھی کہ یہ بڑی ہاٹ عورتیں ہیں اور فیصلہ یہی تھا کہ پہلے یہ عورتیں پڑھ لے تو فیصلہ سنایا جائے گا۔ جب ان عورتوں سے پوچھا گیا کہ آپ نے کتاب پڑھ لی۔ تو عورتوں کا کہنا تھا کہ بھئی یہ کتاب پڑھی نہیں گئی۔ یہ بھی بیان آیا کہ کتاب میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس سے کہیں کوئی گرمی پیدا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتاب سے بندش ہٹالی گئی اور مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ ان ہی پر بات ختم نہیں ہوتی ہے ایسے بہت سے لوگ ہیں۔ مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے اور میں یہ بات بار بار کرتا ہوں کہ اخلاقیات کی جب بات آتی ہے تو اخلاقیات کو انسانی جسم سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ کیا اللہ میاں نے انسانی جسم کو بہت بولڈ بنا کر پیش کیا ہے تو پھر یہ سوال اللہ میاں سے پوچھئے کہ اتنا بولڈ کیوں بنایا؟ کہ جب ہم اس جسم کو لکھنے بیٹھتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ افسانہ بولڈ ہے، یہ ناول اخلاقیات سے پرے ہے۔ ہم تو انسانی جسم کے بارے میں لکھ رہے ہیں، ہم انسانی جسم کی نفسیات بتا رہے ہیں اور انسانی جسم کی نفسیات بتانا اخلاقیات سے باہر جانا نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ یہ جو ہمارا جسم مرد کا جسم یا عورت کا جسم ہے یہ کوئی بولڈ چیز نہیں ہے کہ جس پر لکھتے ہوئے مذہبی فتوے لگ جائے یا جس پر لکھتے ہوئے یہ بات کہی جائے کہ بھئی اس شخص نے تمام حدیں توڑ دی، تمام حدوں سے تجاوز کر گیا ہے اور اس نے اس جسم کو عریاں دکھایا ہے۔ شادیاں کیوں ہوتی ہیں، دو لوگ محبت کیوں کرتے ہیں یہ سب تو بھئی مقدس چیزیں ہیں۔ محبت بہت مقدس جذبہ ہے، شادی ایک مقدس رسم ہے جو ہمارے سماج میں ہے۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقیات کی جس

طرح سے تعریف ہمارے ملک میں کی جارہی ہے دراصل وہ ایک گمراہ کرنے والی تعریف ہے۔ اس تعریف سے باہر نکلنا بہت ضروری ہے اور یہ ادیب کے اختیار میں ہے کہ وہ حقیقت نگاری کو کس طرح انجام دیتا ہے۔ یہی چیز آرٹ کہلاتی ہے۔ رہی میری بات تو میں اپنی کہانیوں کو، میں اپنے ناول میں جو اس طرح کے ماحول آتے ہیں میں کہیں سے بھی اس کو بولڈ تصور نہیں کرتا۔ وہ عام سی باتیں ہیں جس میں مرد اور عورت کے درمیان اور ان کے تعلقات کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں بہت گہرائی میں جا کر جب ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو قلم کے کچھ دھاگے نئی باتوں سے الجھتے ہیں۔ یہ جو نئی باتیں ہیں ان کو ہی کچھ کمزور لوگ اخلاقیات سے دور جانا کہتے ہیں۔ میں ایک حقیقت لکھ رہا ہوں لیکن ابھی بھی ہمارا فرسودہ سماج اس حقیقت کو، اس سچائی کو قبول نہیں کرتا۔ اسی لیے اگر آپ دیکھیے تو ۱۹۳۴ء کے آس پاس جب ''انگارے'' منظر عام پر آیا تھا پہلی بار اس میں کوئی بھی افسانہ ایسا نہیں ہے کہ جس پر بندش لگائی جائے لیکن بڑا ہنگامہ ہوا ''انگارے'' پر بندش لگائی گئی اور یہ وہ زمانہ تھا جب وہ لوگ اپنے کمرے میں چھپ کر دروازہ بند کر کے انگارے پڑھا کرتے تھے۔ تو یہ ماحول ہمارے یہاں شروع سے رہا اب مجھے لگتا ہے یہ بڑا بچکانہ ماحول ہے۔ ۲۰۱۸ء کی مہذب دنیا میں آ کر ہمیں اس ماحول سے باہر نکل کر ادیب کو ایک جینوئن ادیب کو اتنی آزادی ضرور دینی چاہیے کہ وہ اپنے دل کی بات کر سکے۔

شافعہ: ذوقی صاحب ایک آخری سوال آپ ماضی کی فکشن تنقید اور عصرِ حاضر کی فکشن تنقید کا کیسا موازنہ کر سکتے ہیں اور آپ کس دور سے متفق ہیں؟

ذوقی: ماضی اور حال کی فکشن کی تنقید میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ماضی میں فکشن کی تنقید کے نام پر بہت زیادہ گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر شخص نے فکشن کی تنقید میں اپنی اپنی تعریف متعین کی اور جو کچھ فکشن کے نام پر تحریر کیا گیا وہ نصابی فکر کے علاوہ اس کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں تھی اور مجھے لگتا ہے کہ ہر نقاد کہیں نہ کہیں اپنے لوگوں کو لے کر، اپنے ہم خیال افسانہ نگار کو لے کر لکھ رہا تھا۔ جیسے پاکستان کی بات کریں جب ہندوستان تقسیم ہوا۔ تو اس وقت پاکستان میں ایسے ادیب تلاش

کیے گئے جن کا تعلق کہیں نہ کہیں اسلامی فکر سے تھا۔ ہندوستان کا معاملہ الگ تھا۔ ہر فکشن کا نقاد اپنے اپنے گروپ کے لوگوں کو اہمیت دے رہا تھا۔ چلو یہ بات صحیح لیکن میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ شمس الرحمٰن فاروقی سے گوپی چند نارنگ تک شمیم حنفی تک کم سے کم فکشن کی تنقید زندہ تھی۔ اس نئے دور میں ان کے بعد میں خلا محسوس کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آدھے ادھورے کچھ لوگ ہیں جو فکشن کی تنقید لکھ رہے ہیں لیکن باضابطہ جس طرح سے فکشن پر کام ہونا چاہیے، کھل کر تنقید ہونی چاہیے ایسا کوئی بھی ناقد اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔

☆☆☆